سید غلام حسن شاہ کاظمی

چند فارسی شعرا اور معاشرے کا محاسبہ

ـــ حکیم ناصر خسرو علوی قبادیانی کا سالِ وفات ۴۸۱ھ کے لگ بھگ ہے۔ ناصر خسرو علوی کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ عالم و فاضل، حکیم و محقق، شاعر و فیلسوف، ادیب و نقاد اور مبلغ و داعی تھے۔ اپنے نظریات و معتقدات میں ممتاز اور معمولات و معاملات میں منفرد حیثیت رکھتے تھے۔ جہاں جاتے عام طور پر کچھ پڑھے لکھے لوگ ان کے خلاف ہو جاتے، کیونکہ وہ ان لوگوں کے قدم بہ قدم چلنے کے خوگر نہ تھے۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ ناصر خسرو نے اپنے ماحول پر جو نقد و احتساب کیا ہے، اس کا کیا انداز ہے۔ پروردگار عالم کے حضور میں اپنے معتقدات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

نیالم بتو اے قدیم و قدیر — زاہلِ خراسان صغیر و کبیر
چہ کردم کہ از من رمیدہ شدند — ہمہ خویش و بیگانہ نیر و خبیر
مقرّم بفرمانِ پیغمبرت — نہ انباز گفتم ترا نہ نظیر
بامّت رسانیم پیغامِ تو — محمدؐ رسولت بشیر و نذیر
قرآن را بہ پیغمبرت ناورید — مگر جبریل آن مبارک سفیر
مقرّم بحشر و بمرگ و حساب — کتابت زبر دارم اندر ضمیر

ناصر کے اصل مخاطب تو اہلِ خراسان ہیں لیکن وہ نسلِ انسانی اور بالخصوص پوری امّتِ مُسلمہ کے سامنے اپنے معتقدات پیش کرتے ہیں اور مشرق و مغرب کے تمام اہلِ اسلام کا یہی نقطۂ نظر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بحث و جدل کی گرم بازاری اور مکابرہ و مناظرہ کا مبالغہ انگیز طور طریق عام ہو چکا تھا اور فکر و ذہن کو ان مبالغہ انگیزیوں کے اثرات نے زہر آلود کر ڈالا تھا، لیکن ناصر خسرو علوی اپنے فکر و ذہن کو تبدیل کرنے کے لیے تیار نہ تھا، اس لیے اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا پڑتا تھا، اور مجادلین تھے کہ وہ اپنی کامیابی اسی میں سمجھتے تھے کہ پروپیگنڈے کی مہم کو

بہرصورت جاری رکھیں۔ ناصرخسرو حکیم و فلسفی تھا، اس لیے حکمت و فلسفے کے موتی رولتا رہتا۔ ایک مقام پر لکھتا ہے:

پروردگانِ دایۂ اقدس اند در قدم — گوہر نیند گرچہ باوصاف گوہر اند
بے بال در مشیت سفلی کشادہ بال — بے پر بر آشیانۂ علوی ہمی پرند
از نور تا بظلمت و از اوج تا حضیض — از باختر بخاور و از بحر تا بر ند
ہستند و نیستند و نہانند و آشکار — ہم بے تو اند و با تو بیک خانہ اندرند
بے دانشاں اگرچہ نکوہش کنند شان — آخر مدبّرانِ سپہر مدوّر ند

ناصرخسرو علوی اپنے عہد کے ماحول اور معاشرے کو سامنے رکھ کر اپنے مشاہدات اور تجربات کو بے کم و کاست لباسِ شعر سے آراستہ کرتے ہوئے ایسا نقد و تبصرہ اور تنقیح و تحقیق پیش کرتا ہے کہ آج کا معاشرہ اس دور کے معاشرے سے ہم دوش و ہم کنار نظر آتا ہے:

گوئی مرا کہ جوہرِ دیوان ز آتش است — دیوان این زمان ہمہ از گل مخمرند
جز آدمی نزاد ز آدم دریں جہاں — اینہا ز آدم ند چرا جملگی خرند
دعویٰ کنند آنکہ براہیم زادہ ایم — چونیک بنگری ہمہ شاگرد آزرند
در بزم گاہ مالک و طوفِ زبانی اند — ایں ابلہان کہ در طلبِ حوضِ کوثرند
خویشے کجا بود کہ دران جا برادران — از بہرِ لقمۂ ہمہ خصم برادرند
آن سنّیاں کہ سرّ تشان بغضِ حیدرؓ است — حقا کہ دشمنانِ ابوبکرؓ و عمرؓ ند
وآنانکہ نیستند محبّان اہلِ بیت — مومن مخوان شان کہ بکافر برابرند
گر عاقلی ز ہر دو جماعت سخن مگو — بگزار شان بہم کہ نہ سلطان نہ جزند
ہان تا ازان گروہ نباشی کہ در جہاں — چوگاؤ میخورند و چو گرگاں ہمی درند
نہ کافرے بقاعدہ نہ مؤمنی بشرط — ہمسائیگانِ من نہ مسلماں نہ کافرند

یہ ایک عظیم علمی، ادبی، شعری، فلسفی اور مبصر شخصیت کا تبصرہ و محاکمہ ہے۔ یہ اس کے تجربات و مشاہدات ہیں، اور لوگوں سے عام میل جول کے نتائج ہیں۔ آپ چاہیں تو آج کے معاشرے کو اس دور کے معاشرے کے بالمقابل کھڑا کر دیں۔ لباس و پوشاک اور شکل و صورت کا اختلاف تو نظر

آئے گا لیکن امرِ واقعہ اور حقیقتِ حال وہی دکھائی دے گی جو اس وقت تھی۔ کہا جاتا ہے کہ مشرق کی شاعری فقط گل و بلبل اور فحاشی و ہوس رانی کی شاعری ہے۔ لیکن مشرق کی شاعری پر اس قسم کے اکثر الزامات محض تعصب اور سیاسی وجوہ کی بنا پر لگائے جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ تبصرہ مذہبی سا نظر آتا ہے، لیکن مذہب معاشرے سے الگ بھی کہاں ہے؟ مذہب اسلام تو معاشرے کو محاسن سے آراستہ کرتا ہے اور یہی محاسن امن و امان اور نظم و ضبط کی کفالت کرتے ہیں۔ اس بنا پر جہاں بات مذہبی ہے وہیں معاشری و سیاسی بھی ہے۔ یہ معاشرے کے ان لوگوں کو سرزنش اور تنبیہ کی گئی ہے جو انسانیت کے لیے ناسور بن گئے ہیں۔ عام معاشرہ ان ہی لوگوں کو دیکھ کر بے راہ روی اختیار کرتا ہے۔

● ـــــ رشید وطواط، جن کا پورا نام رشیدالدین محمد بن عبدالجلیل کاتب العمری ہے، ابتداءً بلخی ہیں، پھر خوارزم میں بس گئے تھے۔ رشید کا سالِ وفات امیر دولت شاہ سمرقندی نے ۵۷۸ھ بتایا ہے۔ رشید وطواط فاضل، ادیب اور شاعر تھے۔ سرکار دربار سے تعلق رکھتے تھے۔ بادشاہ خوارزم شاہ کی مدح میں انھوں نے قصیدہ کہا اور مدح و ثنا کی حد کر دی۔ لیکن اسی قصیدے میں بادشاہ کے حضور میں عام صورتِ حالات، ماحول کی ملمع کاری اور معاشرے کی ابتری و بدحالی ایسے بلاغتِ بیان سے ادا کی کہ بادشاہ ناراضی کے بجائے خوش گوار تاثرات لینے پر مجبور ہو گیا۔ رشید وطواط کا تجزیہ ملاحظہ ہو:

فریاد ازیں جہاں کہ خردمند اندرو ـــ بہرہ بجز نوریب و حرماں نمی رسد
جہاّل در تنعّم و ارباب فضل را ـــ بے صد ہزار غصہ یکے نان نمی رسد
جاہل بمسند اندر و عالم برونِ در ـــ جوید بحیلہ راہ بدربان نمی رسد
آزردہ شد بحرصِ درم جانِ عالماں ـــ وین خواری از گزاف بدیشاں نمی رسد
دردا و حسرتا! کہ بپایان رسید عمر ـــ وین حرصِ مُردہ ریگ بپایان نمی رسد
منت خدائے را کہ مرا در پناہ تو ـــ آسیب و حادثہ بدل و جان نمی رسد

ان اشعار سے پہلے بادشاہ کی مدح کے اشعار ہیں اور ان کے بعد کے اشعار بھی بادشاہ کی ثناگستری میں ہیں۔ سلطان و شاہ کے دربار شخصی دربار ہوتے تھے۔ ان کی مرضی کے خلاف کوئی بات کہنا موت سے دوچار ہونا تھا۔ رشید وطواط نے بڑی عقل مندی اور سلیقہ شعاری سے

عمدہ پیرائے میں مزاجِ سلطانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو باتیں اس کے نزدیک ضروری تھیں، کہہ ڈالی ہیں۔ ایک موقع پر اس نے ایک بادشاہ کی مدح کی، دوسرے موقع پر ایک دوسرے بادشاہ کی توصیف کر دی۔ کہیں حمایت کہیں مخالفت۔ اس کے مخالف بادشاہ نے قسم کھائی کہ رشید گرفتار ہو کر آیا تو اس کے سات ٹکڑے کر دیے جائیں گے۔ وہ گرفتار ہو کر آیا، حکم جاری ہوا، رشید وطواط کا ایک شناسا دوست سرکار دربار میں باریاب تھا۔ اس نے مجلسِ شاہ میں عرض کیا، اور تھا وہ بادشاہ کا مزاج داں! کہ حضور! وطواط بہت ضعیف اور چھوٹی سی شے ہے، اس کے سات ٹکڑے نہیں کیے جا سکتے، اجازت ہو تو کسی نہ کسی طرح دو ٹکڑے کر دیے جائیں۔ بادشاہ ہنس پڑا اور حکم دیا کہ اسے رہا کر دیا جائے۔

▬ عبید زاکانی کا عہد بہ حدود ۷۴۷ھ ہے۔ یہ بہت بڑا فاضل اور ظریف تھا، اور شاعر و ادیب تھا۔ اس کی چند تصنیفات یادگار ہیں جن میں ایک مثنوی موش و گربہ بھی ہے۔ یہ مثنوی حکمران اور معاشرے پر طنز و تعریض کا سرمایہ ہے۔ میرے کتب خانے میں اس مثنوی کی ایک نقل محفوظ ہے۔ چند سال پیشتر عبید زاکانی پر ایک سیر حاصل مقالہ لکھا تھا، وہ بھی اشاعت کا منتظر ہے۔

عبید زاکانی کی شاعری بڑی دلچسپ اور پُراز معانی ہے۔ وہ معاشرے کی عکاسی اور نقش گری بڑی قادر الکلامی سے کرتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ آپ بیتی بیان کر رہا ہے، اور قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید کا مصداق ہے۔ بعض نے اسے مسخرہ اور ہزل گو سمجھا ہے اور اس کے ادیبانہ و شاعرانہ اندازِ بیان کے مبصرانہ پہلو کو نظر انداز کر ڈالا ہے۔ حالانکہ یہ بے انصافی ہے۔ یہاں عبید زاکانی کی شوخی، برجستگی، ندرتِ بیان اور قدرتِ اظہار دیکھیے:

در علم و ہنر چو من مشو صاحب فن   تا نزدِ عزیزان نشوی خوار چو من
خواہی کہ شوی قبولِ اربابِ زمن   کنک آور و کنکری کن و کنگرہ زن

یعنی میں علم و ہنر میں صاحب فن ہوں، تو نہ ہو، کہیں خویش و اقارب میں میری طرح ذلت و خواری سے دوچار نہ ہو جائے۔ تو چاہے کہ اکابر عہد تجھے پسند کریں، تو بس نغمہ گوئی، طبلہ نوازی اور سارنگی کا پیشہ اختیار کر لے۔

اس کے ماحول اور معاشرے کی ستم ظریفی، خیرہ ذوقی، بے کیفی اور علمی بے مائگی کی اس سے بہتر

کیا نقش گری اور نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ وہ خود اسی معاشرے کا فرد ہے اور اس میں چل پھر رہا ہے، لیکن اس کے جذبات اور احساسات مجروح اور خون آلود ہیں۔

عبید زاکانی کی ہم عصر ایک شاعرہ اور ادیبہ جہاں خاتون تھی۔ معاش و مصارف نے تنگ کیا تو وہ اس کے ہاں گیا۔ لیکن بدقسمتی سے اس رئیس خاتون کی وزیر سلطنت سے شادی ہو گئی۔ یہاں خاتون کی نسبت اس کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

گر غزل ہائے "جہاں" روز بہ ہندوستان فتد روح خسرو با حسن گوید کہ ایں ... گفتہ است

اس شعر نے اس کی معلومات کا بازار سجا دیا ہے۔ پہلے مصرعے کے آخری لفظ "فتد" کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ عبید کوئی اور لفظ بھی لا سکتا تھا۔ "جہاں" کا لفظ بھی ملحوظ رہے۔ یہاں "فتد" کے ذریعے جہاں خاتون کی تضحیک و تحقیر کو ابھارا ہے۔ دوسرے مصرعے میں جہاں میں نے نقطے لگا دیے ہیں، اس جگہ لفظ ذرا عریاں ہے۔ جب اس نے اس کی شادی کا حال سنا تو مایوسی سے دوچار ہوا۔ چنانچہ چار مصرعوں میں جہاں خاتون کی توہین و تحقیر کر دی ہے:

وزیرا! جہاں قحبۂ بے وفاست ترا از چنیں قحبۂ ننگ نیست
برو ... فراخی دگر را بخواہ خدائے جہاں را جہاں تنگ نیست

(یہاں بھی عریاں سا لفظ ہے۔ میں نے نقطے لگا دیے ہیں)۔

عبید زاکانی بڑا تنگ دست تھا اور قرض میں ڈوب گیا تھا۔ اس نے اپنے مقروض ہونے کے موضوع پر ایک غزل کہی ہے۔ یہ غزل کیا ہے۔ ماحول اور معاشرے کی ستم رانیوں، تغافل کیشیوں، علم دشمنیوں اور ادب ناشناسیوں پر احتجاج کا مرقع ہے:

مردم بعیش خوش دل و من مبتلائے قرض ہر کس بعیش شغلی و من در بلائے قرض
فرش خدائے و قرض خلائق بگردنم آیا ادائے فرض کنم یا ادائے قرض؟
در کوچہ قرض دارم و اندر محلہ قرض در شہر قرض دارم و اندر سرائے قرض
غرقہ کنم بقلزم و اتبیل وجود خویش گر بشنوم دہند بشہرے سرائے قرض
عرضم چو آبروئے گدایاں بباد رفت از بسکہ خورستم زدر ہر گدائے قرض
گر نوابہ تربیت نہ کنند عبید را مسکین چگونہ باز رہد از جفائے قرض

امیر دولت شاہ سمرقندی نے تذکرۃ الشعرا میں یہ غزل نقل کی ہے اور پھر اپنی نسبت اس سے موازنہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"بجلال و قدر ذوالجلال وکفی باللہ شہیدا! کہ از روزگار عبید گزشتہ ایں دمندے چوں ایں مظلوم کہ مؤلف ایں تذکرہ است -، ہیچ کس را در نیافتہ - از یک طرف بفلاکت رعیتی مبتلا است - وطرفے دیگر از ہجوم قرض خواہان در بلاست - عبید از یں عبد (امیر دولت شاہ سمرقندی) سبکسار تر بود - چہ اگر قرض داشت محصل نداشت - اگر جد از وئمی خرید ند بہزل مشغول می بود، و از سفرہ بزرگان نلنے می ربود - ایں دعاگو کہ از آغاز تباشیر صبح سعادت ایں خانوادہ دولت را بندہ زادہ بودہ باشند - واجداد ایں مستمند دریں دولت جاں سپاری و نیکو بندگی کردہ باشند - الیوم بمذلت خاک شوری نانے حاصل سازد و محصلانِ شدید و علم دارانِ پلید ایں لقمہ را از و در ربانید و ایں بندہ ملک پدری و موروثی روز بروز بفروشد و از درخانہائے بدگمانانِ قرض کند و از نہب محصل روز چوں خفاش در سوراخی شود و شب در بدر خانہائے علمدارانِ داد خواہی نماید - یمکن اگر وقوف یا بند ارباب حکم و فرمان ایں مذلت در حق ایں خاکسار نہ پسندند"[۱]

یعنی اللہ بزرگ و برتر کے جلال کی قسم اور وہ اس پر بہت بڑا گواہ ہے کہ عبید سمرقندی زاکانی کے عہد سے گزر کر اس تذکرہ (امیر دولت شاہ سمرقندی) کے حالِ زار کو دیکھیے کہ یہ اس سے کہیں زیادہ مظلوم ہے، اور اپنے حال کے مطابق کسی اور کو نہیں پاتا - ایک طرف مفلوک الحال رعیت کا غم لاحق ہے، دوسری طرف قرض خواہوں کا ہجوم بلا ہے - عبید بے چارا ان بلاؤں سے سبک دوش تھا - اگر عبید پر قرض تھا تو مالیہ کی ادائیگی سے آزاد تھا - اگر اس کی کسی چیز کا کوئی خریدار نہ تھا تو وہ ہزل گوئی کا شغل اختیار کر لیتا اور اکابر کے دسترخوان پر جا بیٹھتا تھا - میں تو بچپن سے حکمران کا خاندانی نیاز مند اور خدمت گزار ہوں - میرے آبا و اجداد نے حکمران خاندان کی خیر خواہی اور چاکری میں عمریں گزار دی ہیں - آج بڑی ذلت سے لبوں تک نان کا کوئی ٹکڑا پہنچتا ہے - تحصیلدار سخت گیر اور نمبردار پلید خصلت ہیں، اور وہ اس لقمے کو بھی چھیننے کے درپے ہیں - میں اپنا پدری موروثی ملک بیچتا ہوں - قرض خواہوں کو دیتا ہوں اور قرض خواہوں کے خوف سے دن کو چمگادڑوں کی طرح چھپ جاتا ہوں اور رات کو

---

[۱] - تذکرۃ الشعرا دولت شاہ سمرقندی، ص ۱۹۷

نمبرداروں کے ہاں انصاف ڈھونڈتا ہوں۔ ممکن ہے کہ سرکاری حکم جاری ہو جاتے اور خاکسار کی یہ ذلت سرکار کو پسند نہ ہو۔"

ھ۔ باباسودائی ابیورد (ایران) کے رہنے والے تھے۔ پہلے ان کا تخلص خاوری تھا۔ امیر دولت شاہ سمرقندی نے اپنے تذکرۃ الشعرا میں شعرا کے طبقۂ ششم میں ان کا نام رقم کیا ہے۔ باباسودائی ابیورد کے گاؤں سگان میں رہتے تھے۔ وہی ان کا مدفن بھی ہے۔ ابیورد کے لوگوں کو جانی قربان نام قبیلے کے لوگ سخت تکلیف دیتے اور تنگ کرتے تھے۔ حکام تک ان کا رسوخ تھا۔ ان کے خلاف کچھ کہنا کارگر نہ ہوتا تھا۔ جانی قربان لوگوں نے مالیہ کی وصولی میں سگان کی تاراجی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ باباسودائی نے بادشاہ کی مدح میں قصیدہ کہا اور اسی قصیدے میں " مردم جانی قربان" کی شکایت بھی کی۔ سلطان نے آگاہ ہو کر ان لوگوں کی جائدادیں بحق سرکار ضبط کر لیں اور انھیں مرو اور طوس میں آبادکاری کے لیے بھیج دیا۔

قصیدے کی نوک پلک ملاحظہ فرمایئے۔ باباسودائی کی عرض گزاری، جرأت اور بے باکی کے کیا کہنے:

ملک ویران شود از جانقی "جانی قربان" — وز قرلتائے بد میر محمد تو قان
چشم ظالم ز پئے بے سرو پا گمرہ دون — کردہ دزدی و دغا پیشۂ بے نام و نشان
در دماغ ہمہ شان فکر کلاب و خراسان — در خیال ہمہ شان ذکر خروج و طغیان
نائب دست چپ از نیست بگو سعد الملک — بردم اسپ گرہ از چہ زند تا بستان
ہست دانا و دلیل ہمہ مولا قاسم — خوش دلیلیست "اذا کان غرابا" برخوان
پادشاہا! بکن ایں قوم مخالف را دور — یا بکن کوہ کلات چو فلک را ویران

اس مدح نامے کا آخری شعر تو پوری شکایت کی روح ہے:

نیک خواہان ترا "دولت بر لاسی باد" — بدسگالان ترا محنت "جانی قربان"

باباسودائی کے عہد میں عجب اتفاق ہوا کہ ان کے معاصرین میں چار منصب دار تھے (۱) قاضی ابوسعید خر (۲) خواجہ جلال استر (جانی قربان) (۳) صدر الدین سگ دارد غہ اور (۴) محمد کلہ گاد

باباسودائی کی طبعِ رواں اس پر رواں ہوگئی اور کہا :

بادر دبسان اسیائی است — چرخش ہمہ غصہ است و غم ناد
داروغہ سگ ست وقاضیش خر — عامل شتر و محصلش گاد
زینہا چہ بود نصیب رعیت — لت خوردن و زر شمردن و داد

ماحول اور معاشرے کا، لسانِ شاعر اور کیا اور کس طرح جائزہ لے؟ احساسات وجذبات اس سے بہتر طریق پر کیسے اُجاگر کیے جائیں۔ بادشاہ اور حکام تک صاف بات پہنچا دینا شاعری کے کمالات سے بھی ہے اور احساسات سے بھی۔

باباسودائی کے رگ و ریشے میں دینِ اسلام رچا بسا ہوا تھا۔ حضور علیہ السلام کے حضور میں عربی شاعری جس طرح عقیدت وارادت کا اظہار کرتی اور مسرت و ابتہاج کے نغمے الاپتی ہے، وہی تسلسل وتواتر، وہی اخلاص ومحبت، وہی عشق وفدویت اور فراست وبصیرت باباسودائی کے کلام میں ملتی ہے۔ فرمایا :

برلوحِ سیم صبح بکلکِ زر آفتاب — بنوشتہ نامِ احمدؐ والقابِ بوتراب
یعنی دو بُود اسم ومسمیٰ ہماں یکے — احول دو دید شان و یکے بود در حساب
برخوان حدیث "لحمک ولحمی" وسرہ پیچ — بشنو رموز "دمک دمی" ورخ متاب
از خیلِ انبیا نبی اللہؐ ہاشمی — و ز جمعِ اولیا اسد اللہ بوتراب

باباسودائی کا سالِ وفات ۸۵۳ھ ہے۔ اللہ تعالیٰ غریقِ رحمت کرے، کیا سماں باندھا ہے؟